خیمۂ گل

انتخاب کلام

محمد علی تاج

مکتبۂ افکار بھوپال

تعاون

ٹائٹل اسکیچ	سوویت دیس اردو سے
ڈویلپمنٹ اور کلر اسکیم	محمد حسین ماول
کتابت	مبارک شاہ خاں
طباعت	علوی پریس بھوپال
ٹائٹل کی طباعت	
ترتیب و تزئین	شوکت پرویز
قیمت	ڈیڑھ روپیہ
سول ایجنٹس	پیپولز بک ڈپو ابراہیم پورہ بھوپال
	اشتیاق عارف
(جملہ حقوق محفوظ)	مکتبۂ افکار بھوپال

متھرا بابو

اور

اسرار اعظمی

کے

نام

محمد علی تاج

مری غزل میں زمانے کے مسئلے آ کر
حسین ہو گئے رنگِ رُخِ بتاں کی طرح

مجھے یاد تھے نوٹ کر لئے۔ اس کا پتہ مجھ سے لیا اور اُسی شام تاج کو ایک مختصر سا خط بھی لکھا۔

تاج کی غزل نئی غزل کی پوری طرح نمائندگی کرتی ہے۔ فن، ادب، سماج اپنے ارتقا کے لئے نئی نسل ہی سے نئے لہو کا تقاضا کرتے ہیں۔ غزل جو ہمارے ادب کی شاندار روایت ہے اور جس کے بغیر اردو شاعری کا تصور ممکن نہیں، جس کا نام آتے ہی ہماری صدیوں کی تہذیب سمٹ کر ہمارے سامنے آنے لگتی ہے، ہماری جذباتی اور وجدانی کیفیات، ہماری معاشرت، تمدن اور اخلاق کی ہزار ہا جھلکیاں اپنے چہرے سے نقاب سرکاتی محسوس ہوتی ہیں، ایک عظیم الشان ورثہ کے طور پر نئی نسل تک پہنچی ہے۔ تاج آج کی نسل کے ان چند شعرا میں سے ہے جو صحیح معنوں میں اس بار امانت کو سنبھالنے کی اہلیت رکھتے ہیں، جن کی کاوشیں آج غزل کو اور زیادہ دلکش، تابناک اور حیات افروز بنانے میں صرف ہو رہی ہیں۔

تاج بہت کم گو شاعر ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے منتخب کہتا ہے۔ اسکی غزل تین، چار یا حد سے حد پانچ شعروں سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ وہ مقدار سے زیادہ معیار کا قائل ہے، ایک سچے فنکار کی طرح۔ وہ شعر بڑے اعتماد سے کہتا ہے۔ اس کے شعروں میں وہ اعتماد صاف جھلکتا ہے جو صرف سماجی سمجھ بوجھ اور پختہ شعور سے پیدا ہوتا ہے اسکی غزل میں "روحِ عصر" ہے۔ آج کے سماجی اور سیاسی مسائل پوری شعریت کے ساتھ اسکی غزل میں رچے ہوئے ہیں۔ اس کے فن میں

کلاسیکی، رومانی اور ترقی پسندانہ روایات اور تجربات کا حسین تانا بانا ہے جس نے اسکی غزل کو خوبصورت انفرادی رنگ دیدیا ہے۔

مری غزل میں زمانے کے مسئلے آکر
حسین ہو گئے رنگِ رخِ بتاں کی طرح

وہ اگر یہ دعویٰ کرتا ہے تو کوئی اس دعوے کو جھٹلا نہیں سکتا۔

موجودہ دور میں اقبال، جوش، یگانہ، جگر، فراق، جذبی، فیض اور مجروح نے غزل کو جس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ نئی نسل کی ادبی جدوجہد اُسے اور آگے لے جانے کے لئے بیتاب ہے۔ میں جب تاج کے ان اشعار کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان میں اسی حوصلے کی تاب و توانائی نظر آتی ہے:-

غمِ زمانہ جسے آپ موت کہتے ہیں
ہمیں یہ موت نہ ملتی تو مر گئے ہوتے

سرخرو ہیں کہ ابھی پاؤں میں چھالے ہیں بہت
جہد والوں میں مقدر نہیں دیکھے جاتے

کتنے تاریک مراحل سے گزرنا ہوگا
شمع کو شمعِ سرِ راہگزر ہونے تک

محرکاتِ غم و درد کا پتہ بھی بتا
بیاں نہ کر غمِ ہستی کو داستاں کی طرح

ہم ہیں وہ چاک گریباں جو زمانے کے لئے
شوقِ پیراہن زر تار لئے پھرتے ہیں

آبلہ پائی کا رُخ ہے آج بازاروں کی سمت
اب وہ دیوانہ کہاں جو سوئے صحرا جائے ہے

نظر لگے نہ کہیں اس کو چاند تاروں کی
جو ایک ذرۂ گردوں شکار راہ میں ہے

ہم آج مشعلِ خورشید لیکے نکلے ہیں
ہمیں قبول نہیں جگنوؤں کی راہبری

اور یہی وہ حوصلہ ہے جو اسکے شعور کی آواز بن کر ہمارے سامنے اس طرح آتا ہے:-

چراغِ راہ بنے شمع انجمن نہ رہے
خدا کرے کہ مرا فن بھی میرا فن نہ رہے

تاج نے زندگی کا دکھ درد دیکھا اور سمجھا ہی نہیں بلکہ سہا بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ طبقاتی کشمکش اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کی بات کرتا ہے تو اس کے لہجے میں تلخی اور ترشی ہوتی ہے۔ اس کے یہ شعر مجھے ایسی شبنم محسوس ہوتے ہیں جس میں کسی شعلہ کا عکس ہی نہیں اس کی حدّت، طراری اور بیباکی بھی رچی ہوئی ہو۔

چاک داماں د گریباں پہ ہنسی آتی ہے
کیسے انساں ہو کہ انساں پہ ہنسی آتی ہے

یہ مہر و ماہ تو اس انجمن کی زینت ہیں

ہم اپنے گھر کیلئے روشنی کہاں سے لائیں

تم کہ شکستِ جام کے عادی

ہم کہ شکستہ جام کو ترسیں

آزادی کے اونچے سورج

گلیاں تیرے نام کو ترسیں

مرہم تو کچھ اور ہی شئے ہے، ترسے حرفِ تسلی کو

یوں تو خود ہم نے بھی نہ دیکھا زخموں کو گہرائی تک

نغمہ دل کو بھاتا کیا

جگ روتا میں گاتا کیا

تاجؔ کے ان اشعار میں وہی آگ دبی ہے جو انقلاب کے سینے میں بھڑکتی ہے، جسکی آنچ میں تپ کر ذرے مہر و ماہ کے ہمسر بنتے ہیں۔ تاجؔ کی غزلوں میں موجودہ طبقاتی نظام سے بیزاری ہے، نسل و رنگ کے امتیازات کے خلاف احتجاج ہے، انسانی جد و جہد پر مکمل اعتماد ہے۔ وہ نئی سحر پر یقین رکھتا ہے وہ انسانی درد کو محسوس ہی نہیں کرتا اسکے درماں سے بھی واقف ہے۔

درد اس دور کی تقدیر ہے لیکن اے دل

صرف اک معرکۂ محنت و زر ہونے تک

اس بھرپور سماجی بصیرت کے ساتھ ساتھ تاجؔ کی غزل میں عشق کی والہانہ کیفیات بھی ہیں۔ وہ عشق کی عظمت کا احساس رکھتا ہے اور عشق کی تہذیب سے واقف ہے۔ اس کا عشق خوددار عشق ہے۔ وہ متاعِ دل و

جہاں قربان کرنے کو تیار ہے لیکن اپنا "بانکپن" قربان نہیں کرسکتا۔

متاعِ دل بھی تری ہے یہ جان وتن بھی ترے
ہر ایک شے ترے صدقے ہے بانکپن کے سوا

مری انا کو گوارا نہ ہو سکی خیرات
تری نگاہ مری چارہ گر تو ہو جاتی

ہمارا کیا ہے دوانے ہیں کچھ بھی کر گزریں
یقیں کرو کہ تمہارا وقار راہ میں ہے

نہ خلوتیں ہی میسّر نہ محفلیں ہم کو
کوئی بتاؤ کہاں انتظار یار کریں

جاگ اٹھے ہیں تو کریں فکرِ سحر تا بہ سحر
پیار کے خواب مکرّر نہیں دیکھے جاتے

مختصراً، تاج کی غزل میں جو سماجی شعور، جو جذباتی گہرائی، جو انسانیت کی لگن، جو تہذیبی رچاؤ، جو فنی اعتدال اور احساسِ جمال، جو رنگ و آہنگ اور خونِ جگر ہے وہ اس کو نئی نسل کا ایک ممتاز شاعر منوا دینے کے لئے کافی ہے۔ تاج جو اپنے شہر بلکہ اپنے صوبے کا سب سے مقبول اور ہر دلعزیز شاعر ہے، کل ہندوستان گیر شہرت کا مالک بنے گا، یہ میری سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے۔

میں نے تاج کی شاعری پر بہت اختصار کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ جب تک میں یہ سطریں لکھتا رہا تاج کا چہرہ، اسکی مانوس آنکھیں، اسکی زندگی آمیز مسکراہٹ، میرے سامنے گھومتی رہی۔ اسکی سیاہ رنگ کی جلد کے نیچے کتنا حساس دل اور کتنا خوبصورت ذہن چھپا ہوا ہے جو اس مجموعے کے ہر لفظ سے جھانکتا نظر آتا ہے، ایک باشعور انسان اور ایک اعلیٰ درجے کا فنکار۔

آں سیہ چردہ کہ شیرینیٔ عالم با اوست ؞ چشمِ میگوں، رُخِ خنداں، دلِ خرّم با اوست

بمبئی ———————— ۱۰ ستمبر ۱۹۵۹ء

مجروح سلطانپوری

'خیمۂ گل' بھوپال کے نوجوان شاعر محمد علی تاج کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ تاج بنیادی طور پہ غزل کے شاعر ہیں اور میرے نزدیک انھیں ان نوجوانوں میں شمار کیا جانا چاہیئے جو نئی غزل کا حال و مستقبل ہیں۔

غزل کا نام آتے ہی اس سلسلے کے وہ تمام ہنگامے یاد آتے ہیں جو بہار میں کلیم الدین احمد اور پنجاب میں جدید اور آزاد شاعری کے ارباب حل و عقد سے شروع ہوکر یوپی میں ڈاکٹر عبدالعلیم سے ہوتے ہوئے میرے عزیز دوست ظ انصاری پر ختم ہو جاتے ہیں اور شائد ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے ہیں اسلئے کہ اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ غزل دشمنی کا سبب یاروں کے عرفان کی کمی تھی ورنہ یہ الزام کہ غزل زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتی، اتنا ہی مہمل ہے جتنا یہ کہنا کہ نغمہ زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

ازمنۂ وسطیٰ میں جہاں ہم جاگیرداری کی تہ سے سرمایہ دار رشتوں کو ابھرتے دیکھتے ہیں، جہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رسمِ غلامی کی آخری

کڑی بھی ٹوٹ رہی ہے اور فرد کی آزادی اور انسانی مساوات کا سوال اس وقت کا فلسفہ بن چکا ہے وہاں ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اسی زمانے کی پیداوار "صنفِ غزل" زمانے کا ساتھ دے رہی ہے۔ جہاں فردوسی کے اشعار بہت پہلے سے عوام کا ترانہ بن چکے تھے وہاں حافظ کی غزل بھی اس وقت کے اہلِ حرفہ، کسانوں اور طالب علموں کا مداوائے دردِ جگر بن گئی تھی۔ یعنی فلسفۂ وحدۃ الوجود جو اس وقت کا انقلابی فلسفہ ہے اور جس نے پہلی بار صحیح معنوں میں مساوات کا نعرہ دیا اور تقسیم ازلی کے تصور کو رد کرکے حاکم و محکوم کی تقسیم کو تقسیم دنیاوی کہا اُسے رومی کی نظموں کی طرح حافظ کی غزل بھی اپنے سینے سے لگا چکی تھی اور یہ تھا پہلا ثبوت جو غزل نے زمانے کے ساتھ چلنے کے سلسلے میں دیا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے قیدِ زماں اور ایران کے قیدِ مکاں سے گزر کر جب غزل ہندوستان آئی تو میر و غالب کے لباس میں نمودار ہوئی وہ میر و غالب جن سے اقبال جیسا نظم گو شاعر نہ تو ملا سکا لیکن آگے بھی جا سکا یا نہیں یہ سب کو معلوم ہے۔ چنانچہ اب اردو شاعری کے افق پر تین آفتاب چمک رہے ہیں۔ میر، غالب، اقبال۔

اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند شعراء نے نظم کو رواج دینے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن "ان میں" سے یا "ان کے نقادوں" میں سے جن حضرات نے شاعری کو کسی ایک صنف تک محدود رکھنے کی باتیں کی ہیں ان کے اس عمل کو ترقی پسندی سے دور کا بھی لگاؤ نہیں تھا اور نہ ہے۔

لیکن ان "ناصحوں" کی دوستی نے غزل کہنے والوں پر ایک احسان ضرور کیا (جو انکی طرف سے ارادۃً نہیں تھا بلکہ ردِ عمل کے طور پر ہوا) کہ غزل کو سیاست کی چھوت چھات سے بچانے کا جو عام رواج تھا وہ ختم ہو گیا۔ اور ایک نئے میدان نے انھیں زحمتِ غزل سرائی دی۔ لیکن چونکہ یہ راستہ تقریباً بالکل ہی نیا تھا اسلئے چلنے والے کبھی سلامتی کے ساتھ چلے کبھی چھلانگیں بھی لگائیں اور کبھی لڑکھڑائے اور منہ کے بل بھی گرے۔ لیکن کثرتِ رفتار نے جادہ بنا ہی لیا۔ ایک شاہراہ قائم ہوئی اور ہمارا ایک کارواں چل پڑا۔ بقول غالب

خارہا از اثر گرمیٔ رفتارم سوخت

منتے بر قدم راہروان ست مرا

چنانچہ اس شاہراہ کے قائم کرنے والے اور اس پر چلنے والے گروہ کے ایک فرد محمد علی تاج بھی ہیں۔ ان کا انداز یہ ہے کہ بات زیر لب کہتے ہیں مگر ایسی کہ دل میں گھر کر کے رہے۔ اپنے سننے والے کو چونکا دینا ان کا معمول ہے۔ تعارف کے طور پر چند ہی اشعار کافی ہوں گے۔

شرر تیشہ سے روشن ہو کہستانِ حیات رگِ ہر سنگ میں اک رَو ہو تمناؤں کی

اب چاند ہے ہاتھوں میں سن اے لیلیٰ رگیتی

ہم تیرے لئے تجھ سے بھی آگے نکل آئے

پہنچ کر سینۂ انسانیت میں

نہ دھڑکے تو ہمارا دل نہیں ہے

یہ تو انسانوں کے ٹوٹے ہوئے دل ہیں ساقی

ہم سے ٹوٹے ہوئے ساغر نہیں دیکھے جاتے

یہ حال اپنا کیا گردشِ زمانہ نے

کہ اس نگاہِ کرم کو بھی غم شمار کریں

میں شہر کے کئی صورتگروں کے پاس گیا

کسی سے بن نہ سکی یادِ یار کی صورت

موسمِ زر میں کنول تیرے نہیں کھل سکتے

اے دلِ نازدہ عہدِ لب و رخسار تو آئے

دلوں کے پھول، تبسم کے پھول، پیار کے پھول

کھلیں یہ پھول تو پھر برق کا چلن نہ رہے

اس دور میں زندگی کے تقاضوں کو سامنے رکھکر غزل کو جن لوگوں نے آگے بڑھایا ہے اور اس کے مزاج کا احترام کرتے ہوئے چلے ہیں۔ اور اس مرحلے میں کم غلطیاں کی ہیں، ایسے نام چند ہی ہوں گے لیکن ان ناموں سے محمد علی تاج کے نام کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

مضمون، ہیئت، تشبیہات و استعارات کا توازن اور رچاؤ ایسی شرط ہے جہاں سے جادو بیانی شروع ہوتی ہے اور تاج اس سرحد میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہر چند یہ صحیح ہے کہ ہمارے نقاد نے ابھی ان کو وہ مقام نہیں دیا ہے جس کے یہ مستحق ہیں۔ لیکن اس سے بددل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاج ہی کے الفاظ میں

"محرومِ نمو کلیوں سے بادِ سحر کتنے سانس چرائے گی"

انھیں اپنے خلوصِ فن پر قائم رہنا ہے کہ وقت ہی سب سے بڑا نقاد ہے۔

بمبئی ——— جوہو، روڈ

انصاری

رائے وہ دے کسی کے کام یا کلام پر جس کی اپنی کوئی ٹکی بندھی اور قطعی رائے ہو، یہاں زندگی کے طلسم خانے میں وہ ہوش ربائی ہے کہ ہم بھی بہوت اور ہماری رائے بھی بہوت۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ سائینسی تجربوں کی ہماہمی میں شاعری کی مرصّع سازی کا کیا بنے گا۔ ابھی سے شعر کا چہرہ فق ہے۔ اور اس کے بدن میں اینٹھن سی نظر آتی ہے۔

زرا دیر پہلے میں ٹیلی ویژن پر روسی شعرار کا مشاعرہ سن رہا تھا۔ ایک صاحب (سرگئی وسیلی یف) نے فرمایا کہ وہ ہفتہ بھر سے ایک نظم اس راکٹ پر کہنے کی تیاری کر رہے تھے جو چاند پر ایک حصّہ اتار کر نکل گیا۔ لیکن ابھی وہ نظم پوری نہ ہو پائی تھی کہ چاند اور زمین کے درمیان سائینسی تجرباتی اسٹیشن قائم ہو گیا۔ یعنی نظم کہے جانے سے پہلے ہی وہ آوٹ آف ڈیٹ ہو گئی۔ اس کے بعد انھوں نے تازہ ترین نظم سنائی۔ میں روسی زبان کی عام شاعری سمجھ لیتا ہوں بھائی مجھے تو ان بھلے آدمیوں میں ایک کی بھی (سائینسی) نظم جچی نہیں ہر چند کہ موضوع تازہ تھا لیکن ٹیکنک وہی ۴۰ برس ادھر کی۔ اور کچھ اُوپری اُوپری سی لگتی تھی۔

شاید یہ ہمارے اس عہد کی، اس شاعری کا، جو کلاسیکی زبان و بیان سے چپکی ہوئی ہے، سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

تم جانتے ہو کہ میں تمہارے کلام کا، تمہاری آواز کا (اگر ادھر چار سال کے ٹھہرے کی ٹھرک نے بگاڑ نہ دی ہو) اور تمہارے والہانہ انداز کا دلدادہ ہوں۔ تینوں کو ملا کر دیکھتا ہوں تو ایک ہی چوکھٹے کی تصویر نظر آتی ہے ایسی جس میں عاشق کا گداز ہے اور معشوق کی سی چھل بل ہے۔ بولو، اب اگر رائے دو نگا تو یک طرفہ ہوگی نا ـــــ کیونکہ میں تو جانبداروں میں ٹھیرا۔

خط میں تمہارا وہ شعر پڑھا۔

اب چاند ہی ہاتھوں میں سُن اے ملی گیتی ؛ ہم تیرے لئے تجھ سے بھی آگے نکل آئے

اور اے چشم دوست تیرے تغافل کا شکریہ ؛ سب کچھ بھلا دیا تھا ترے التفات نے

اور نگاہ بھر کے مجھے دیکھ، جام بھر کے پلا ؛ مری جبیں پہ غم دہر کی شکن نہیں ہے

ایسا لگا کہ برسات کی بھری رات میں کہیں دور جنگلوں میں کوئی مانوس تان دل کو چھوتی ہوئی نکل گئی، ہوک سی اٹھی کہ ان شعروں میں تمہاری اپنی آواز تھی۔ مگر یہ آواز اب سے پانچ سات برس پہلے بھی یہی تھی۔ اس میں اتار چڑھاؤ نہ ہوا، کچھ مند، مدھم اور چھم چھم کا سا۔

ہماری شاعری کے رمز و ایمار کا مطلب بدل جانا چاہیئے تھا اب تک، مگر فیض اور مجروح کی مقبولیت کیا کہتی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا یعنی سمجھ میں تو کچھ آتا بھی ہے مگر لب تک نہیں آتے پاتا۔ خود سوچ لو۔

گھر سے نکلے تھے کہ وہ دیو اور در کافی نہ تھے ؛ اُف یہ ویرانہ کہ اک شوریدہ سر کافی نہیں

اس شعر کا مزا میاں تم کیا لیتے، ہم نے لیا۔ اور خوب لیا، واہ!

از:- ماسکو

تاج میرے لئے

جناب اختر سعید

کم و بیش بارہ سال سے مجھے تاج کی رفاقت کا فخر حاصل ہے۔ اگرچہ وہ مجھسے بحیثیت شاعر متعارف ہوئے تھے لیکن چند ہی دنوں میں میرے لئے انھوں نے اپنی شخصیت کو اپنی شاعری سے زیادہ دلکش اور عزیز بنا دیا۔ وہ خود بھی میرے رفیق ہو کر یہ بھول گئے کہ میں انکی شاعری سے زیادہ انکی ذات کا مداح ہو گیا ہوں حالانکہ اس عرصہ میں انھوں نے جو شاعرانہ مرتبہ حاصل کر لیا ہے اس کا اعتراف نہ کرنا فرض ناشناسی ہے۔ تاج کے بارے میں میرے لئے اظہار رائے بہت دشوار ہے۔ اس لئے کہ وہ میرے اتنے نزدیک آچکے ہیں کہ انکی آواز پر مجھے اپنی آواز کا گمان ہوتا ہے۔

تاج کی شخصیت میں بڑی شگفتگی اور بڑی دلآویزی ہے ہنسی ان کا شیوہ ہے اور شوخی ان کی عادت۔ وہ ہنس ہنس کر دشمن کو دوست بنا لیتے ہیں۔ سنجیدہ سے سنجیدہ ماحول میں بات بات پر ہنس کر بعض اوقات اپنی اور اپنے ساتھیوں کی عافیت خطرے میں ڈالتے ہوئے نہیں چوکتے میں ایسی محفلوں میں یا تو تاج کے اتنے قریب بیٹھتا ہوں کہ بآسانی ان کا گلا

دباسکوں یا اتنی دور کہ اگر بلوہ ہو جائے تو اپنی جان بچا کر نکل جاؤں ہنسی اور مسلسل ہنسی تاج کی شخصیت کا سب سے حسین پہلو ہے۔ میں نے انھیں بڑے سے بڑے غم میں ہنستے ہوئے دیکھا ہے۔ کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی ہے اور تاج ہنس رہے ہیں۔ کون جانے کس درد پر فتح پانے کے لئے تاج نے ہنسی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔

تاج بے حد ذہین ہیں۔ ذہانت ان کے چہرے سے آشکار ہے۔ مجھے خوب یاد ہے ۱۹۵۲ء میں میں نے تاج کا تعارف ایک مشاعرہ میں جگر صاحب سے کرایا، میں نے کہا "یہ تاج ہیں بھوپال کے ......" بات پوری کرنے نہ پایا تھا کہ جگر صاحب قبلہ نے فرمایا: "آگے میں خود دیکھ رہا ہوں، چہرہ بتا رہا ہے کہ نہایت ذہین ہیں"۔

میں نے ایسے چہرے کم دیکھے ہیں جن سے تاج کی طرح ذہانت کی کرنیں پھوٹتی ہوں۔ تاج نے بغیر کسی باقاعدہ تعلیمی سلسلے یا رہبر اور استاد کے جو کچھ سیکھا ہے محض اپنی ذہانت سے۔

تاج نے سپاہیانہ ماحول میں آنکھ کھولی۔ انکے والد فوج میں ملازم تھے اور خود تاج کو بچپن میں گھوڑے کی سواری سکھائی جاتی تھی کہ آگے چل کر وہ فوجی افسر بن سکیں لیکن قدرت نے انھیں کسی اور ہی منصب کے لئے مامور کیا تھا۔ ابھی وہ نو عمر ہی تھے کہ والد کی ملازمت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور تاج کو اوائل عمری ہی میں حالات نے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے خاندان کو سہارا دیں چنانچہ تقریباً بیس برس سے وہ نہ جانے کن کن صبر آزما حالات سے ہنستے کھیلتے گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو تاج نے آنکھ ہی جہد حیات کی طوفانی موجوں میں کھولی، ہر چند کہ ہمارے سماج میں یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے، ہزارہا بچے آنکھ کھولتے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں — لیکن

تاج کو قدرت نے غیر معمولی شاعرانہ دل و دماغ عطا کیا تھا۔ اس عطیۂ فطرت کی تربیت علمی ماحول اور ادبی فضا میں ہونی چاہیئے تھی۔ جس سے تاج کی مکمل شاعرانہ صلاحیتیں بروئے کار آسکیں ۔۔ کاش ایسا ہوتا تو اردو غزل کا موجودہ دور فیض اور مجروح پر ختم نہ ہوتا۔ تاج نے اپنی زندگی کی محرومیوں کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ بڑے فنکارانہ ٹھہراؤ کے ساتھ اس احساس محرومی کو اپنی شاعری میں منتقل کر دیا ہے۔ تاج چونکہ حساس دل کے ساتھ بیدار ذہن کے مالک بھی ہیں اسلیئے انھوں نے حیات کی محرومیوں کو صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ سمجھا بھی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے۔ تاج نے سمجھ لیا کہ غم ذات اصل میں غم کائنات ہے اس دنیا میں تنہا وہی محروم نہیں ہیں، ان کے ساتھی ان گنت ہیں جبتک اس نظام کا ڈھانچہ نہیں بدل جاتا محرومیوں سے چھٹکارہ پانا ممکن نہیں ہے تاج نے اپنے فن کو اسی شجرِ درد کی بیخ کنی کے لئے وقف کر دیا ہے۔

تاج کی شاعری میں احساس محرومی کی جو فضا ہے اس پر یاس اور ناامیدی کا سایہ نہیں ہے بلکہ امید اور یقین کے جگنوؤں کی چمک ہے۔ تاج کی لَے درد مندانہ ہے اور لہجہ عاشقانہ۔ محرومی کے احساس، یقین کی روشنی، درد مندلَے اور عاشقانہ لہجہ نے تاج کی شاعری کو اس حُسن سے سنوارا ہے کہ کہیں کہیں تو نظر نہیں ٹھہرتی۔

تاج کا اپنا آہنگ ہے، انکے آہنگ میں نہ سختی ہے نہ درشتی، نعرۂ انقلاب ہے یا نظامِ حیات کو بدلنے کا منصوبہ انکی آواز کی حلاوت اور شیرینی میں فرق نہیں آتا۔ وہ چیخ کر اپنی بات سُننے والوں تک نہیں پہنچاتے۔ بات کا مقصود خواہ سوتوں کو جگانا ہی کیوں نہ ہو ۔۔ تاج کے آہنگ میں یہ تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ساز کے سب تار جھنجھنا اُٹھے ہیں لیکن تاروں کے اچانک ٹوٹنے سے

جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ کبھی سنائی نہیں دیتی۔ آواز کا یہ فنکارانہ ٹھہراؤ نہ صرف تاج کے فنی شعور کا غماز ہے بلکہ انکی مقبولیت کا ضامن بھی۔

تاج کا اسلوب بیان منفرد ہے جو ایک زندہ رہنے والے فنکار کی پہچان ہے، تاج کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر شعر میں کوئی خاص بات بھی نہ ہو اور کون ہے جس کے ہر شعر میں خاص بات ہوتی ہے، تب بھی اپنے اسلوب سے اسے خوشگوار بنا دیتے ہیں انکے انداز بیان کا شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ ہے۔ تاج کی یہ خوش اسلوبی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

تاج کی شاعری جذبہ اور خیال کا حسین امتزاج ہے شعوری یا غیر شعوری طور پر تاج کی شاعری میں یہ اہتمام ہے کہ جذبہ اور خیال قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی ہیں اور الگ الگ بھی، دلکشی کا وہی عالم ہے۔ تاج فلسفی اور مفکر نہیں ہیں لیکن انکے شعروں میں سوچ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ عاشق بھی نہیں ہیں لیکن عشق کی کسک ان کے شعروں میں نمایاں ہے۔ تاج نے براہِ راست عشقیہ جذبات کا اظہار بہت کم کیا ہے۔ نہ جانے کس حرماں نصیبی کے احساس نے تاج کو کھل کر عشق بھی نہیں کرنے دیا اور وہ عشق کو بھی غمِ روزگار کے حوالے کر کے چپ ہو رہے ہے۔

تاج کے شعر پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی کا سب کچھ لٹ گیا ہے وہ ہر ہر چیز پر علیحدہ علیحدہ ماتم کرنے کے بجائے ایک مجموعی اثرِ غم کے تحت اداس ہے، لیکن بڑے ہی اعتماد کے ساتھ پھر سے اسباب زندگی فراہم کر رہا ہے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

ابھی خیال و نظر کا غبار راہ میں ہے
بہار آ کے رہیگی بہار راہ میں ہے
"بڑھے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی"
یہ وہ مقام ہے جس کا شمار راہ میں ہے
ہمارا کیا ہے دِوانے ہیں کچھ بھی کر گزریں
یقیں کرو کہ تمھارا وقار راہ میں ہے
نہ پاؤں تھمتے ہیں اپنے نہ حوصلے دل کے
سُنا ہے جب سے کوئی خارزار راہ میں ہے
نظر لگے نہ کہیں اس کو چاند تاروں کی
جو ایک ذرۂ گردوں شکار راہ میں ہے

یادِ گیسو و قدِ یار لئے پھرتے ہیں

ہم کہیں ہوں رسن و دار لئے پھرتے ہیں

ہم ہیں وہ چاک گریباں جو ز لانے کیلئے

شوقِ پیراہنِ زرتار لئے پھرتے ہیں

مدتیں ہو گئیں اس دامنِ رنگیں سے چھُٹے

آج تک دیدۂ خوں بار لئے پھرتے ہیں

شرم اے زعمِ مسیحائی کہ اب بھی لاکھوں

جسمِ بیمار و دلِ زار لئے پھرتے ہیں

وہی رہا دلِ غمگیں کسی سے کچھ نہ ہوا
ستم یہ ہے کہ تری دوستی سے کچھ نہ ہوا
تمام نغمگی و شاعری سے کچھ نہ ہوا
وہ رات ہے کہ مری روشنی سے کچھ نہ ہوا
تری نگاہ کی جادوگری کو دیکھ لیا
تری نگاہ کی جادوگری سے کچھ نہ ہوا
چلو کہ آج ستاروں کی سیر کر آئیں
کوئی یہ کہہ نہ سکے آدمی سے کچھ نہ ہوا

چاکِ داماں و گریباں پہ ہنسی آتی ہے
کیسے انساں ہو کہ انساں پہ ہنسی آتی ہے

تم کہ ہر منزلِ دشوار سے ہٹ جاتے ہو
ہم کہ ہر منزلِ آساں پہ ہنسی آتی ہے

یہ بنائے ہوئے رنگ اور یہ تراشے ہوئے پھول
مجھکو اس جشنِ بہاراں پہ ہنسی آتی ہے

رات اک زلفِ پریشاں کیلئے روتا ہوں
صبح ہر خوابِ پریشاں پہ ہنسی آتی ہے

ہم کو اک کھیل ہیں یہ طوق و سلاسل صیّاد
ہم کو زنداں میں بھی زنداں پہ ہنسی آتی ہے

علاجِ دردو غمِ زندگی کہاں سے لائیں
کہو جو صبر کریں، صبر بھی کہاں سے لائیں

یہ مہر و ماہ تو اس انجمن کی زینت ہیں
ہم اپنے گھر کیلئے روشنی کہاں سے لائیں

یہ سرد سرد ستارے، دھواں دھواں مہتاب
جو دل کو پھونک دے وہ چاندنی کہاں سے لائیں

ہمارے شعروں نے توڑے تو ہیں ہزار طلسم
تری نگاہ کی جادو گری کہاں سے لائیں

حرم و دیر کے منظر نہیں دیکھے جاتے
دیکھنے والوں سے پتھر نہیں دیکھے جاتے

سرخرو ہیں کہ ابھی پاؤں میں چھالے ہیں بہت
جہد والوں میں مقدر نہیں دیکھے جاتے

شوقِ درماں ہو تو آرد شنیٔ دل لے کر
زخمِ دل شمع جلا کر نہیں دیکھے جاتے

یہ تو انسانوں کے ٹوٹے ہوئے دل ہیں ساقی
ہم سے ٹوٹے ہوئے ساغر نہیں دیکھے جاتے

جاگ اٹھے ہیں تو کریں فکرِ سحر تا بہ سحر،
پیار کے خواب مکرر نہیں دیکھے جاتے

خطِ حیات سے ہٹ کر ہر ایک نقش گری
نہیں وہ نقش گری ماسوائے دردِ سری

تمھاری بزم سے باہر بھی ایک دنیا ہے
مرے حضور، بڑا جرم ہے یہ بے خبری

بس اک لگن ہے کہ روشن ہے شمع سی دل میں
فغانِ نیم شبی ہے نہ گریۂ سحری

میں اپنے غم کا مداوا تو خود ہی کر لوں گا
مبارک آپ کو اپنا غرورِ چارہ گری

ہم آج مشعلِ خورشید لیکے نکلے ہیں
ہمیں قبول نہیں جگنوؤں کی راہبری

میرا ہی خونِ دل ہے فروزاں محفل سے تنہائی تک
میرے ہی افسانے ملیں گے چیخوں سے شہنائی تک

فاصلہ یک جرأت ہے دار سے لے دارائی تک
پاگل یہ زنجیریں ہیں صرف تری انگڑائی تک

مرہم تو کچھ اور ہی شے ہے تر سے حرفِ تسلّی کو
یوں تو خود ہم نے بھی نہ دیکھا زخموں کو گہرائی تک

امن کی خاطر زیست کی خاطر سارا مشرق جاگ اٹھا
لاکھوں کروڑوں ہاتھ اٹھے ہیں دلّی سے شنگھائی تک

نظریں جواں ہیں، شوق جواں، دل جواں ہے آج
آجائے سامنے جو کوئی آسماں ہے آج
جو ہم میں ہے وہ مہر و مہ و کہکشاں ہے آج
جو رہ گیا وہ گردِ پسِ کارواں ہے آج
وہ بھی تو کشتیاں تھیں جو ساحل سے جا لگیں
مانا کہ بحرِ درد بہت بیکراں ہے آج
میں جس جگہ ہوں ساتھ مرے کائنات ہے
تیرے سوا کوئی بھی نہیں، تو جہاں ہے آج

تو ہے تو صبا نے یہ نئے رخ بھی دکھائے
چھو لے تری زلفوں کو تو خوشبو نظر آئے

شاید کہ پگھل جائیں سیہ رات کے سائے
کہدو کوئی ساقی سے مجھے نور پلائے

خاکِ دلِ برباد کو برباد کرو اور
ممکن ہے یہی خاک کہیں پھول کھلائے

گھبرا کے غمِ ہجر سے جب جام اٹھایا
مجھ کو تری تصویر میں آنسو نظر آئے

اب چاند ہے ہاتھوں میں سن اے لیلیٰ گیتی
ہم تیرے لئے تجھ سے بھی آگے نکل آئے

دل کی باتیں کسی حسیں سے کہیں
پر کہیں بھی تو کس یقیں سے کہیں

برف سی جم رہی ہے ہونٹوں پر
کس کے رخسارِ آتشیں سے کہیں

ہر جگہ ہے تو اس فسانے میں
تو جہاں سے کہے وہیں سے کہیں

ہم تو سمجھا کے ہار بیٹھے ہیں
آپ ہی کچھ دلِ حزیں سے کہیں

آنسوؤں کی کہانیاں اے تاجؔ
کب تک اپنی ہی آستیں سے کہیں

دل تیری نظر کی شہ پا کر ملنے کے بہانے ڈھونڈے ہے

گیتوں کی فضائیں مانگے ہے، غزلوں کے زمانے ڈھونڈے ہے

آنکھوں میں لیے شبنم کی چمک، سینے میں لیے دوری کی کسک

وہ آج ہمارے پاس آ کر کچھ زخم پرانے ڈھونڈے ہے

کیا بات ہی تیری باتوں کی، لہجہ ہے کہ ہے جادو کوئی

ہر آن فضا میں دل اڑ کر تاروں کے خزانے ڈھونڈے ہے

پہلے تو چھٹے تھے دیر و حرم پھر گھر چھوٹا پھر مے خانہ

اب تاج تمھاری گلیوں میں رونے کے ٹھکانے ڈھونڈے ہے

بہت دنوں سے نظر میں ہے یار کی صورت
غمِ زمانہ سے لیکن فرار کی صورت

نظر تو آئے کہیں سے بہار کی صورت
نکالئے تو کوئی اعتبار کی صورت

کھلا ہوا ہے درِ میکدہ دلوں کی طرح
مہک رہی ہے فضا زلفِ یار کی صورت

ہزار مرحلۂ زیست سامنے آئے
بدل بدل کے تمنّائے یار کی صورت

گھر میں ترے پیغام کو ترسیں
باہر جلوۂ بام کو ترسیں
تم سورج اور چاند سے کھیلو
ہم کہ چراغِ شام کو ترسیں
تم کہ شکستِ جام کے عادی
ہم کہ شکستہ جام کو ترسیں
اور ابھی کچھ رات ہے باقی
اور ابھی آرام کو ترسیں
آج ہزاروں کام ہیں باقی
پھر بھی ہزاروں کام کو ترسیں
آزادی کے اونچے سورج
گلیاں تیرے نام کو ترسیں

اٹھ رہی ہیں دیواریں ڈھل رہی ہیں زنجیریں
میرے خوابِ زرّیں کی مل رہی ہیں تعبیریں
مہر و ماہ و انجم کے باوجود اندھیرا ہے
جانے کس نے دنیا سے چھین لی ہیں تنویریں
جُز سیاہ داغوں کے کچھ نہیں جبینوں پر
گھِس رہی ہیں صدیوں سے پتھروں پہ تقدیریں
شغلِ بادہ و ساغر تیری انجمن تک تھا
آج رزمِ ہستی میں کھنچ گئی ہیں شمشیریں
اے عظیم فنکارو! زندگی کے معمارو!
منہ نئے مصور کا تک رہی ہیں تصویریں

ہے عینِ ہنر مندی ہر بے ہنری کب سے
محرومِ نظّارہ ہے صاحب نظری کب سے

میخانے میں، زنداں میں گلشن میں، بیاباں میں
سر پھوڑتی پھرتی ہے آشفتہ سری کب سے

سازوں کے لئے کب سے بیتاب ہیں آوازیں
رنگوں کو ترستی ہے تصویر گری کب سے

ہو جائیں صف آرا سب محرومِ نمو کلیاں
روکے ہوئے سانسیں ہے بادِ سحری کب سے

اے مہرِ تمنا آ، جاگی ہوئی آنکھوں میں
کانٹا سا کھٹکتا ہے نجمِ سحری کب سے

نغمۂ سحر ہو گا نغمۂ طرب ہو گا
شورِ ختم، ماتم کا کون جانے کب ہو گا

روح پارہ پارہ ہے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہے
پوچھئے جو دامن کو، تھا کہاں جواب ہو گا

صبح غیر ممکن ہے آفتاب سے پہلے
تو بہت بڑھا بھی تو ماہتابِ شب ہو گا

شعاعِ مہر کی شبنم سے بن نہیں سکتی
غمِ جہاں کی ترے غم سے بن نہیں سکتی

یہ فیصلہ ہے ہمارا ترے لئے صیّاد
چمن میں رہ کے تری ہم سے بن نہیں سکتی

حیات جہد و عمل سے ہے ورنہ موت اچھی
حیات گریۂ و ماتم سے بن نہیں سکتی

ہزار کچھ ہو، مگر زاہدوں کی جنّت میں
یہ تجربہ ہے کہ آدم سے بن نہیں سکتی

زندگی جبر کی حامل کبھی ایسی تو نہ تھی
شکلِ زندان و سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

آ کے بیٹھا تھا کہ کچھ وضعِ محبّت رہ جائے
جا رہا ہوں کہ یہ محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

اس سے پہلے بھی سحر دیکھی ہے شب دیکھی ہے
بے حسیِ نگہ و دل کبھی ایسی تو نہ تھی

کبھی کوئی گم ہوا نہیں ہے ہمارے نقشِ قدم پہ چل کے
خود آپ بھی سرخرو ہوئے ہیں ہماری راہوں کی خاک مل کے

لُٹے ہوئے قافلے وہی ہیں، تمام تر مسئلے وہی ہیں
ہدف وہی تیر بھی وہی ہیں مگر ذرا زاویے بدل کے

کوئی بھی تخلیق خونِ دل کے بغیر عظمت نہ پا سکے گی
وہ تاج ہو یا حسیں اجنتا کہ شعر ہوں میرؔ کی غزل کے

کوئی تو نام دیجے اس فضائے نور و ظلمت کو
نہ مہرِ صبح نکلا ہے، نہ ماہِ شام آیا ہے
مئے گلفام آئیگی، جب آئے گی جب آئے گی
ابھی تو صرف ذکرِ ساقیٔ گلفام آیا ہے
رگوں میں دوڑ جاتی ہے جو صہبا زندگی بن کر
اسی پر آج خونِ خلق کا الزام آیا ہے
جسے ہو زعمِ یکتائی وہ تنہا جی کے دکھلاوے
زمانے کو بدلنے میں زمانہ کام آیا ہے
سنور کر آؤ اے لالہ رخو! آئینہ خانوں سے
تمھارے شہر میں اک ناقدِ اصنام آیا ہے

کچھ احترامِ گردشِ حالات کیجئے
یارانِ میکدہ کی مدارات کیجئے
ایجادِ عہدِ غم میں وہ نغمات کیجئے
دیپک جَلائیے، کبھی برسات کیجئے
پی کر شراب شعلے سے شعلہ بجھائیے
کچھ معتدل تو شدّتِ جذبات کیجئے
سوچیں گے صبح، دن یہ گزاریں گے کس طرح
فی الحال فکر ہے کہ کہاں رات کیجئے

دل کو کوئی آزار تو ہوتا
اپنا کوئی غمخوار تو ہوتا
صحرا ابھی کر لیتے گوارا
ذکرِ در و دیوار تو ہوتا
سایۂ زلفِ یار نہیں تھا
سایۂ یادِ یار تو ہوتا
آنکھوں سے کچھ خون ہی بہتا
وہ دامن گلکار تو ہوتا
لاکھ طلوعِ مہر تھے لیکن
کوئی شب بیدار تو ہوتا

نغمگی گھٹ رہی ہے سینے میں
گیت پرواز کو ترستا ہے
اُف یہ تنہائیِ حیات کہ دل
تیری آواز کو ترستا ہے
اب کوئی نامہ ہے نہ کوئی پیام
راز داں راز کو ترستا ہے
زندگی کا حسین افسانہ
حرفِ آغاز کو ترستا ہے

کبھی یہ پرسشِ زخمِ جگر تو ہو جاتی
تواضعِ نمک و نیشتر تو ہو جاتی ٥

میں شکوہ سنج نہیں تیری بے وفائی کا
تری وفا سے یہ شب مختصر تو ہو جاتی

مری انا کو گوارا نہ ہو سکی خیرات
تری نگاہ مری چارہ گر تو ہو جاتی

.

.

.

اے چنگاری! راکھ نہ بن
پھونک دے میرا ہی دامن
تجھ سے وفا کی امیدیں
دیکھ مِرا دیوانہ پن
ہم دُکھیوں سے ہنس کر مِل
کیا جوبن، کیا مایا دَھن
مجھ میں اپنا عکس نہ دیکھ
میں ہوں اک ٹوٹا درپن

عشرتِ رنگ و بو کہاں، لذتِ گفتگو کہاں

یعنی بہار ہے کہیں، ذکرِ بہار ہے کہیں

ایک جگہ نہ مل سکے، دل کے کنول نہ کھل سکے

ابرِ بہار ہے کہیں، گیسوئے یار ہے کہیں

کعبہ و دیر میں کبھی، محفلِ یار میں کبھی

اے دلِ درد آشنا تجھ کو قرار ہے کہیں

قصۂ مرگِ دل ہر اک سے کہو
تا کہ احباب اُس نظر سے بچیں
وصل کے عیشِ مختصر پہ نہ جائیں
ہجر کی شامِ بے سحر سے بچیں
تم بھی بے مہر، دہر بھی ظالم
داغِ دل سے کہ زخمِ سر سے بچیں
جو بھی رستہ ہے تیرے گھر کا ہے
کس طرح تیری رہ گزر سے بچیں

حُسن کی رائے تو کوئی پوچھے
عشق کی سادگی کے بارے میں
آپ کچھ مسکرا کے فرمائیں
کھلنے والی کلی کے بارے میں

تبصرے کر رہی ہے تشنہ لبی
تیری دریا دلی کے بارے میں
اپنے بارے میں صرف کیا سوچیں
سوچنا ہے سبھی کے بارے میں

تیری آنکھوں کی کہانی ساغروں تک آگئی

زُلف تیرے رُخ سے اُڑ کر میکدے پر چھا گئی

تھام کر دل راہِ غم میں بیٹھ جانا ہی پڑا

یاد تیری آئی اور زنجیر سی پہنا گئی

تری آنکھ کے تذکرے کُو بہ کُو ہیں

زمانہ شرابی ہوا جا رہا ہے

مرے پیار کی دھوپ پڑتے ہی دیکھو

وہ چہرہ گلابی ہوا جا رہا ہے

اَے دردِ عشق یہ بھی کوئی دوستی ہوئی
مدت سے زندگی ہے تماشا بنی ہوئی
ان سے میں کیا کہوں مجھے یہ تو بتائے جا
جن دوستوں سے تیرے لئے دشمنی ہوئی
اے ساقیٔ بہار یہ کیسی بہار ہے
گزری نہ اپنے سر سے گھٹا تک بھری ہوئی

نہ اپنوں سے کوئی شکوہ نہ بیگانوں کا رونا ہے

جو پورے ہو نہیں سکتے اُن ارمانوں کا رونا ہے

بڑی تہذیب سے اہلِ غمِ دل سر جھکائے ہیں

نہ زنجیروں کا شکوہ ہے نہ زندانوں کا رونا ہے

اگر تجھ کو یقیں آئے، تو سب تیرا تصرف ہے

نہ دیوانوں کا ہنسنا ہے، نہ دیوانوں کا رونا ہے

نقیبِ صبحِ نَو تھے ہم، رہینِ شامِ غم نکلے
بڑے جھوٹے ترے وعدے، ترے قول و قسم نکلے
انھیں دیر و حرم والے بھی کتنا پیار کرتے ہیں
تری محفل سے جتنے باغیِٔ دیر و حرم نکلے
جو دیکھا تو زمیں بھی دور تھی پائے تجسُّس سے
جو سمجھا تو ستارے بھی مرے زیرِ قدم نکلے

ایک مدت سے سرِ راہ گزر بیٹھے ہیں
نام تو تاج ہے اور خاک بسر بیٹھے ہیں
جن کے نغموں سے لرز جاتی تھیں راتیں وہ بھی
خواب گاہوں میں بامیدِ سحر بیٹھے ہیں
حاصلِ راہ یہی ، حاصلِ منزل ہے یہی
اپنے دامن میں لئے گردِ سفر بیٹھے ہیں

اس طرح رو کے شکایات کی توہین نہ کر
غم کی دیرینہ روایات کی توہین نہ کر

باندھ کر بندِ قبا قید نہ کر جوشِ بہار
کھول کر زلف سیہ رات کی توہین نہ کر

اے مرے سروِ رواں مجھ سے الگ ہٹ کے نہ چل
صحنِ گلشن میں مساوات کی توہین نہ کر

چشمِ مےگوں جو نہیں بادۂ گلفام تو ہے
پینے والے بھری برسات کی توہین نہ کر

انھیں دیکھیں کوئی کیسے مٹائے
وہ جن کو عشق کے غم راس آئے

وہ منزل کیا جو آسانی سے طے ہو
وہ راہی کیا جو تھک کر بیٹھ جائے

کہاں فرصت کہ تیرے پاس آئیں
جو آئے بھی تو ہم مصروف آئے

غمِ دنیا کی جلتی دوپہر میں
غنیمت ہیں تری زلفوں کے سائے

بڑا غرور تھا ہم کو جو اشک آنکھ میں تھے
یہ رنگ بھی ترے رنگِ حنا نے چھین لیا
بھٹکتے لاکھ مگر منزلیں تو پا لیتے
ہر اعتماد ترے نقشِ پا نے چھین لیا
وہی تو تھا مرا سرمایۂ حیات اے دوست
جو عیشِ غم تری دادِ وفا نے چھین لیا
سفیرِ مہرِ یقیں تھا وہ اک ستارہ جسے
سیاستِ سحرِ شب نما نے چھین لیا

وہ آنکھیں کیا جنھیں آیا نہ رونا
دلوں کی موت ہے غم کا نہ ہونا
غموں کی آنچ حد سے بڑھ چکی ہے
بڑی مشکل ہے میٹھی نیند سونا
زمانے بھر کا غم اپنا لیا ہے
قیامت ہو گیا حسّاس ہونا

جو انسانیت کی زباں بن گئی ہے

وہی داستاں، داستاں بن گئی ہے

وہاں بھی زمیں ہی کو سب مانتے ہیں

جہاں یہ زمیں آسماں بن گئی ہے

الگ تھی تو قطرے سے کم تھی یہ ہستی

ملی ہے تو موجِ رواں بن گئی ہے

بتاؤ کوئی زندگی کے علاوہ

کوئی شے اگر جاوداں بن گئی ہے

مرا خونِ دل مژدۂ فصلِ گل تھا

مری خاکِ دل گلستاں بن گئی ہے

سایۂ ابر ملا سایۂ گیسو نہ ملا
جام اگر ہاتھ بھی آیا ترا پہلو نہ ملا
سب کے سب ہو گئے افلاک کے تارے شاید
اس زمیں پر تو ہمیں کوئی بھی آنسو نہ ملا

زخمِ دل و جگر کی نمائش فضول ہے
ہر ایک سے علاج کی خواہش فضول ہے
یہ جلوہ ہائے راہگزر، وہ بھی مختصر
اے فرصتِ نظر یہ نوازش فضول ہے

درد تھا حشر بھی ہزار اُٹھے
سچ نہ بولیں تو رسم دار اُٹھے

اے غمِ عشق تجھ سے ہار گئے
جان دے کر بھی شرمسار اُٹھے

جانے کس درد کے تعلق سے
رات دشمن کو ہم پکار اُٹھے

اب تو اس زلف کی گھٹا چھا جائے
دل سے کب تک یونہی غبار اُٹھے

دامن پہ ستارے نہیں جگنو ہی سجالیں
اس تیرگیٔ شب میں یونہی جشن منالیں

وہ ہاتھ کسی اور کی قسمت میں ہے شاید
آ! برگِ حنا تجھ کو ہی آنکھوں سے لگالیں

اک شیشۂ مے روز اگر آئے میسّر
ہم گردشِ دوراں کی کوئی بات نہ ٹالیں

یہ گرد کھوئے ہوئے کارواں سے اچھی ہے
مری زمین ترے آسماں سے اچھی ہے
کوئی ملے نہ ملے ہم گزر تو سکتے ہیں
کسی کی راہگزر کہکشاں سے اچھی ہے
وہ بزمِ عارض و گیسو میں رک نہیں سکتے
جنھیں خبر ہے یہ دنیا کہاں سے اچھی ہے

رخصتِ اہلِ غمزۂ و ناز
فرض نے دی ہے پھر آواز
محفل میں ہر سو ہے اندھیرا
مطرب کوئی شعلۂ ساز
رات کٹی، آثارِ سحر ہیں
لیکن اُس کی زلفِ دراز
تیرے فسانے کا انجام
میری حقیقت کا آغاز

چراغِ راہ بنے شمعِ انجمن نہ رہے
خدا کرے کہ مرا فن بھی میرا فن نہ رہے

دلوں کے پھول، تبسّم کے پھول، پیار کے پھول
کھلیں یہ پھول تو پھر برق کا چلن نہ رہے

نگاہ بھر کے مجھے دیکھ، جام بھر کے پلا
مری جبیں پہ غمِ دہر کی شکن نہ رہے

تمھارے قبضۂ قدرت میں مہر و ماہ سہی
مگر یہ کیا کہ مرے پاس اک کرن نہ رہے

تری خاطر یہ ہنگامہ بھی اے صُبحِ وطن دیکھیں
کہ سب منزل کو دیکھیں اور ہم دار و رسَن دیکھیں
ہزاروں ہیں جو اس صحرائے غم میں پابرہنہ ہیں
ہم اپنے واسطے کیا سایۂ سرو و سمن دیکھیں

قبرِ ماضی پر نہ رو ہنگامۂ امروز دیکھ
موت پیچھے ہے ترے، اور زندگی ہے روبرو
رزم گاہ و میکدے میں فرق مشکل ہو گیا
اس قدر نزدیک کس نے رکھ دئے سیف و سبو

وہ جس میں روحِ مستقبل نہیں ہے
کوئی اس شعر کا قائل نہیں ہے
عبادت کی جزا معلوم لیکن
محبّت بھی تو بے حاصل نہیں ہے
یہ موجِ مے ڈبو دیتی ہے بے شک
مگر تیری طرح قاتل نہیں ہے
غرورِ فتحمندی ہے نظر میں
شکستِ دل شکستِ دل نہیں ہے

نغمہ، دل کو بھاتا گیا
جگ روتا، میں گاتا گیا
مے خانے میں جاتا گیا
آنسو تھے چھلکاتا گیا
اُن کے غم کا فیض کہو
ورنہ مجھ کو آتا کیا

جو چراغِ رہِ وفا نہ ہوا
وہ ہمارا تو نقشِ پا نہ ہوا
منزلیں تجربوں نے بخشی ہیں
تو کسی کا بھی رہنما نہ ہوا
جو سرِ دار مسکرا نہ سکا
اُس سے جینے کا حق ادا نہ ہوا

کوئی تنویر نہیں، کوئی بھی تعبیر نہیں
خواب ہی خواب ہیں اس شب میں سحر ہونے تک

کتنے تاریک مراحل سے گزرنا ہوگا
شمع کو شمعِ سرِ راہگزر ہونے تک

آہ سے راہ نکالی ہے عمل کی ہم نے
ہم کو جینا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

درد اِس دَور کی تقدیر ہے لیکن اے دل
صِرف اک معرکۂ محنت و زر ہونے تک

رات جب سویرے سے مات کھانے لگتی ہے
اپنے ہی ستاروں کا خوں بہانے لگتی ہے
آپ ایسے پھولوں کو حکمِ مرگ دیتے ہیں
موت دیکھ کر جن کو رحم کھانے لگتی ہے
جب بھی دیکھتا ہوں میں حشر آدمیت کا
دل میں اک قیامت سی سر اُٹھانے لگتی ہے
ہائے رے یہ محرومی تشنگانِ الفت کی
ذکرِ زلف و عارض سے نیند آنے لگتی ہے
جب بھی ذکر آتا ہے اپنے کارناموں کا
تو جبیں مورّخ کی جگمگانے لگتی ہے

اس خموشی میں کہیں سے کوئی جھنکار تو آئے
جام و بربط نہ سہی، ہاتھ میں تلوار تو آئے

رزم گاہوں میں بھی پہنچیں گے ترے دیوانے
چھوڑ کر دشت سرِ کوچہ و بازار تو آئے

موسمِ زر میں کنول تیرے نہیں کِھل سکتے
اے دلِ زار! وہ عہدِ لب و رخسار تو آئے

تیرے بھی زیرِ قدم چاند ستارے ہوں گے
پہلے ہم جیسی تجھے مستیِٔ رفتار تو آئے

یہ غم جو آج ہیں پہلے نکھر گئے ہوتے
تو جانے کتنے زمانے سنور گئے ہوتے
غمِ زمانہ جسے آپ موت کہتے ہیں
ہمیں یہ موت نہ ملتی تو مر گئے ہوتے
ہمارے ہاتھ میں ہوتی عناں جو ذروں کی
تو مہر و ماہ زمیں پر اُتر گئے ہوتے

یہی نہیں کہ تصور سے صرف پیار کریں
خزاں نصیب علاجِ غمِ بہار کریں
یہ حال اپنا کیا گردشِ زمانہ نے
کہ اس نگاہِ کرم کو بھی غم شمار کریں
نہ خلوتیں ہی میسّر نہ محفلیں ہم کو
کوئی بتائے کہاں انتظارِ یار کریں
لکھیں تو کس کو لکھیں تاج نامۂ پُر شوق
دکھائیں کس کو اگر انگلیاں فگار کریں

آبلہ پائی کا رُخ ہے آج بازاروں کی سمت

اب وہ دیوانہ کہاں جو سوئے صحرا جائے ہے

میری آنکھوں کی طرح بھیگی ہوئی ہے کائنات

ابر جب بھی آئے ہے اک درد برسا جائے ہے

نغمۂ صبحِ طرب پر رقصِ شب جاری رکھو

رقصِ شب جاری رکھو، سورج ابھرتا آئے ہے

وہ کارواں جو گزرتے ہیں کارواں کی طرح
سنوار جاتے ہیں راہوں کو کہکشاں کی طرح

یقیں کرو کہ بس اب جسم و جاں کے لالے ہیں
تمھاری یاد کو رکھا تھا جسم و جاں کی طرح

محرکاتِ غم و درد کا پتہ بھی بتا
بیاں نہ کر غمِ ہستی کو داستاں کی طرح

مری غزل میں زمانے کے مسئلے آ کر
حسین ہو گئے رنگِ رُخِ بتاں کی طرح

نہیں ہے زادِ سفر کچھ بھی اس لگن کے سوا
رُخِ وطن کے لئے صبح کی کرن کے سوا

کوئی دیارِ جہاں میں دیارِ غیر نہیں
مگر یہ بات ہے اک تیری انجمن کے سوا

گریز کر کے یہ ثابت نہ کر خدا کے لئے
کہ تجھ میں کچھ بھی نہیں رنگِ پیرہن کے سوا

متاعِ دل بھی تری ہے یہ جان و تن بھی ترے
ہر ایک شے ترے صدقے ہے جان و تن کے سوا

نہ زعمِ فن، نہ غرورِ سخن، نہ فخرِ شعور
مری غزل میں نہیں کچھ خلوصِ فن کے سوا

اس چمن میں گلوں کی ہنسی جرم ہے
یہ بھی کیا زندگی، زندگی جرم ہے
بابِ میخانہ سے کوچۂ یار تک
کچھ اگر ہے تو بس مفلسی جرم ہے
تشنگی لاکھ ہو آتنی قاتل نہیں
اے مرے دوستو بے حسی جرم ہے
اور بستی نہیں شہرِ خوباں ہے یہ
سادہ لوحی، دلِ اجنبی جرم ہے

اُس اک بہار سراپا کی دُھن سمائی ہے
ہمیں تو جنتِ دنیا کی دُھن سمائی ہے
تمھارے ہاتھ میں بربط ہے مرے لب پہ غزل
ابھی سے عشرتِ فردا کی دُھن سمائی ہے
خبر بھی ہے تجھے لیلیٰ کہ ہم کو صحرا میں
بنائے شہرِ تمنّا کی دُھن سمائی ہے

آج دل سوچ رہا ہے جیسے
مے ہر اک غم کی دوا ہے جیسے

جاں ہتھیلی پہ لئے پھرتے ہیں
اک یہی شرطِ وفا ہے جیسے

کہیں موتی کہیں تارے کہیں پھول
دہر تیری ہی قبا ہے جیسے

دشتِ غربت میں ترا نامۂ شوق
ہاتھ میں پھول کھلا ہے جیسے

اس طرح چپ ہیں ترا غم لے کر
یہ بھی قسمت کا لکھا ہے جیسے

کاکی

اپنی مُنّی بیٹی شمیم کے لئے

ستاروں کی بارش ہے آنگن میں میرے چنبیلی زمیں پر جُھکی جا رہی ہے
کِھلی چاندنی پاؤں پر لوٹتی ہے وہ اس طرح پازیب جھنکا رہی ہے

چراغ بن کے جلے اور سو چراغ جلائے
جو راستہ نہ دکھائے وہ راستے میں نہ آئے

منزلوں کی دنیا میں ریت یہ پُرانی ہے
ایک کارواں گزرا، ایک کارواں آیا

اے چشمِ دوست تیرے تغافل کا شکریہ
سب کچھ بھلا دیا تھا ترے التفات نے

تیری نظروں کو ہوا کیا جو جھکی جاتی ہیں
ہم تری راہ میں مٹ کر بھی پشیمان نہیں

شررِ تیشہ سے روشن ہے کُہستانِ حیات
رگِ ہر سنگ میں اک رَو ہے تمناؤں کی

حادثے کیا ہم پہ گزرے تم نے دیکھا تک نہیں
تم اگر سنتے تو آوازِ شکستِ دل بھی تھی

اُٹھیں اور ان کے خط ہی دیکھ ڈالیں
جنھیں دیکھا نہیں دو اک برس سے

کسی نے زندگی دشوار کر دی
محبت ہی محبت کے بہانے

وہ رات جوان کے ساتھ گئی اس رات کا عالم کیا کہیئے
باتیں بھی نہ کیں، چپ بھی نہ رہے، جاگے بھی نہیں سوئے بھی نہیں

یہ الگ ہے کہ ہمیں قیس کا منصب نہ ملا
تجھ کو منوا تو دیا شہر کی لیلاؤں میں

یہ زلف، یہ پیراہنِ رنگیں، یہ سلیقہ
محسوس یہ ہوتا ہے بہاروں میں کھڑے ہیں

ترے خیال کی جسمانیت ارے توبہ
قریبِ دل تری سانسیں سنائی دیتی ہیں

ترے خلوص نے رسمِ وفا بدل ڈالی
مرے خلوص میں باقی نہیں وہ گہرائی

چھین کر نغمات سے خواب آوری
کارِ بیداری لیا نغمات سے

وہ، قیامت جسے کہتے ہیں زمانے والے
دلِ شاعر سے بچے گی تو گزر جائے گی

دورِ ماہ سازی میں کوئی ماہ پارا کیا
چاندنی میں جگنو کیا دھوپ میں شرارا کیا
پھول کیا ہے شبنم کیا، شمع کیا ستارا کیا
حسن حسن ہے تیرا اس میں استعارا کیا
بڑھ کے ڈال دو باہیں بحرِ غم کی موجوں میں
ڈوبتا سفینہ کیا، بیٹھتا کنارا کیا

•

کبھی جو تجھ سے تھی وہ رسم و راہ بھی نہ رہی
مسرتِ نگہ گاہ گاہ بھی نہ رہی
وہ بحرِ تیرہ و تاریک ہے یہ شامِ فراق
کہ ذہن میں تری زلفِ سیاہ بھی نہ رہی

قطعات

سہے تھے غم پر و بازو کی خاطر
خزاں دیکھی تھی رنگ و بو کی خاطر
جو آتا ہے خوشی کی انتہا پر
بہت روئے تھے اُس آنسو کی خاطر

وہی جب ہو گئے بیگانہ ہم سے
انھیں نے کر دیا جب بے سہارا
زمانے سے امیدِ غمگساری
زمانہ کون ہوتا ہے ہمارا

تجھے بھلائے ہوئے تو کئی برس گزرے
مگر یہ آنکھ جو کمبخت نم ابھی تک ہے
نہیں ہے ترکِ ملاقات کا تو غم لیکن
ترے خطوں کو جلانے کا غم ابھی تک ہے

میں چاہتا ہوں نظامِ کہن بدل ڈالوں
مگر یہ بات فقط میرے بس کی بات نہیں
اٹھو، اٹھو، مری دنیا کے عام انسانو
یہ سب کی بات ہے، دو چار دس کی بات نہیں

غزل کے سوا

اُردو

عجیب وقت آپڑا ہے ہم پر، زباں بھی اپنی زباں نہیں ہے
وہ لوریاں جس کی سُن رہے ہیں اُسی کو کہتے ہیں ماں نہیں ہے

وہ چاہتے ہیں کہ گنگا جمنا کے درمیاں اک فصیل اٹھا دیں
بلندیوں کو اسیر کرلیں، ہمالیہ کی جبیں جُھکا دیں
دھنک کو تقسیم کرنے والو، یہ کارِ دانشوراں نہیں ہے

وہ گیت جو روحِ نغمگی ہیں وہ گیت تاثم میں ڈھل نہ جائیں
غبارِ خاطر کے لکھنے والے! تری تصانیف جل نہ جائیں
اک آگ چاروں طرف لگی ہے، جلا رہی ہے دُھواں نہیں ہے

شکنتلا

عمیقؔ[1] نے یہ کہا ہے مجھ سے میں نظم لکھوں شکنتلا پر
عجیب سا کیف چھا گیا ہے دل و نظر پر یہ نام سنکر

سحر سحر ہے فضائے عالم شفق شفق ہے ہر ایک منظر
بجائے خود اک صنم کدہ ہے، ہر ایک پربت ہر ایک پتھر
جواں جواں نیلگوں فلک پر کنول کے پرچم سے کھل گئے ہیں
زمیں پہ چاندی پگھل رہی ہے، نجوم شبنم میں گھل گئے ہیں
امنڈ رہی ہیں حسیں گھٹائیں، دھنک دریچے سے جھانکتی ہے
کرن کرن گل کی اوٹ لیکر بڑے سلیقے سے جھانکتی ہے

[1] میرے دوست اور ایک اچھے شاعر

مہکتی سانسوں کا ہلکا ہلکا فضا میں عنبر بسا ہوا ہے
جوان سینوں پہ جیسے کوئی مہین آنچل کسا ہوا ہے
قطار اندر قطار آہو، خود اپنی مستی میں چل رہے ہیں
ہزار ہا مور ناچتے ہیں، ہزار ہا رنگ ڈھل رہے ہیں
ہزار ہا گاگروں کے سورج زمیں پہ سونا لٹا رہے ہیں
ہزار ہا پائلوں کے گھنگرو فلک پہ رستہ بنا رہے ہیں
یہ کس کے قدموں کی چاپ سُن کر، گلاب کی شاخ جھک گئی ہے
خیال کی آنکھ مُند گئی ہے، بیان کی سانس رُک گئی ہے
یہ یورشِ حسن و رنگ و نکہت اب اور شاید نہ سہہ سکوں گا
یہ نظم مجھ سے نہ ہو سکے گی، یہ نظم میں تو نہ کہہ سکوں گا

سرِ راہ گزر

جب وہ اِس راہ سے گزرتی ہے
رہگزر خود پہ ناز کرتی ہے

یوں سبک ہے کہ کیا صبا ہوگی
پھول سے ہر قدم پہ کھلتے ہیں
دھوپ میں چاندنی نکھرتی ہے
جب وہ اس راہ سے گزرتی ہے

اس کو جانے خبر بھی ہے کہ نہیں
اس کے دامن سے اسکے آنچل سے
شاعری کسبِ رنگ کرتی ہے
جب وہ اس راہ سے گزرتی ہے

ہائے وہ روپ جس طرح کوئی
مورتی روٹھ کر اجنتا سے
روحِ فنکار میں اترتی ہے
جب وہ اِس راہ سے گزرتی ہے

تلخ نوائی

(ایک شاعر دوست کے نام)

نہ آنکھ میں کوئی آنسو، نہ دل شکستہ ہے
اسی لئے ترا نغمہ صدا بہ صحرا ہے

مریضِ جسم و دل و روح کو یہ دعویٰ ہے
وہ اپنے شہر کا سب سے بڑا مسیحا ہے

بغیر انجمنِ اہلِ دل میں آئے ہوئے
تجھے یہ خبط کہ تو انجمن میں یکتا ہے

ترا کلام نہیں ہے ترا سوال ہے یہ
جسے بیاض سمجھتا ہے تو وہ کاسہ ہے

میں نے خاکِ نشیمن کی کب بات کی
شہر بھر میں دھواں ہے تو میں کیا کروں